# تعزیرات اسلامی

(مصطفیٰ احمد زرقا، پروفیسر قانون اسلامی لاء کالج شام)

**تعزیر کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم** لغوی لحاظ سے تعزیر کے معنی ہیں، باز رکھنا۔ تہذیب و شرافت سے بہرہ مند کرنا۔ یہ لفظ مدد اور نصرت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے: فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (جو لوگ رسول پر ایمان لائے اور اس کی مدد و نصرت کی اور اس نور کی اتباع کی جو اس پر نازل کیا گیا ہے، یہی لوگ درحقیقت فلاح پانے والے ہیں) تعزیر میں مدد اور نصرت کا مفہوم بھی اس لیے شامل ہے کہ اس میں دشمن کے انسداد اور استیصال کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اصطلاحِ فقہ میں تعزیر اس سزا کو کہتے ہیں جو قانون میں بلحاظ مقدار و نوعیت بالکل مقرر نہ کر دی گئی ہو، بلکہ جس میں عدالت حالاتِ مقدمہ کے لحاظ سے کمی بیشی کر سکتی ہو۔

یہ سزا حدود و قصاص کے مقدمات کے ماسوا تمام ایسے جرائم اور افعالِ ممنوعہ کے ارتکاب پر دی جا سکتی ہے، جو مرتکب جرم کو زجر و توبیخ کرنے اور آئندہ اُسے جُرم سے باز رکھنے کا تقاضا کرتے ہوں۔

**تعزیر کو اختیاری سزا بنانے کی مصلحت** تعزیر کی نوعیت و مقدار کا تعین اربابِ قضا کو سونپ دینے میں مصلحتِ شرعی یہ ہے کہ جرائم اپنی اشکال و اقسام کے لحاظ سے غیر محدود ہیں۔ اور بسا اوقات ان کی ایسی نرالی قسمیں سامنے آتی رہتی ہیں جن کا پہلے وجود نہیں ہوتا بلکہ کبھی ایک ہی جرم نو بہ نو لبادے اوڑھ کر اور گوناگوں ہتھکنڈے اختیار کر کے سامنے آتا ہے، جس کے انسداد اور بیخ کنی کے لیے ایک ہی نوعیت کی تدابیر کارگر نہیں ہو سکتیں بلکہ دوسرے مؤثر طریقوں کو بھی بروئے عمل لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ شریعت اسلامی نے اپنی گہری حکمت عملی کے پیشِ نظر معروف اور نمایاں جرائم کی ان اقسام، جو براہِ راست اسلام کے انتظامی نظام کی بنیادوں پر حملہ آور ہوتے ہیں، از روئے نص متعین کر کے ان کی سزائیں مقرر کر دی ہیں۔

اور ان کے علاوہ تمام جرائم کے استیصال و بندش کے لیے سزاؤں کی نوعیت اور مقدار کے اختیارات عام اربابِ امر کو تفویض کردیئے ہیں تاکہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق زمان و مکان کے اختلاف، افراد کی حیثیات اور معاشرے کی تہذیبی سطح کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر جرم کی مناسب سزا مقرر کرنے میں آزاد رہیں۔ بعض لوگوں کو معمولی گوشمالی اور انتباہ ہی راہِ راست پر لے آتا ہے۔ اور بعض موٹی کھال کے مجرم شدید عقوبت کا مزہ چکھے بغیر جرم سے دست کش ہونے پر رضامند نہیں ہوتے۔ طبیعتوں کے اسی تفاوت اور اثر پذیری کے فرق کی بنا پر شریعت حاکم کو اس امر کا مجاز ٹھہراتی ہے کہ وہ ایک ہی نوعیت کے فعل پر مختلف سزائیں نافذ کرسکتا ہے۔

حاکم اور قاضی مجرم کے لیے تعزیر کی جو صورت بھی تجویز کریں، اُس میں اپنے سامنے یہ اصول رکھیں کہ وہ شرعی سزاؤں سے مناسبت رکھتی ہو۔ یعنی ان میں انسانوں کو عذاب دینے اور وحشیانہ ایذا پہنچانے کا تصور نہ شامل ہو۔ بلکہ محض ان کو مؤدب و مہذب بنانے اور ان کی سرکشی کو روکنے کا مقصد پیشِ نظر ہو۔ جیسے تازیانے لگانا، قید کردینا، جلاوطن کردینا، مالی جرمانہ عائد کردینا[1]، حتیٰ کہ اگر قاضی جرم کی شدت کے پیشِ نظر موت کی سزا بھی دینا

[1] مالی تاوان عائد کرنے کی سزا پر فقہا میں شروع سے اختلاف چلا آتا ہے۔ کیونکہ اس سزا میں اس امر کا شدید اندیشہ ہے کہ ظالم حکام لوگوں کے اموال پر دست درازیاں شروع کردیں اور جرمانوں کے نام سے لوگوں کے مال وصول کرکے خود ہڑپ کرنے لگیں۔

قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ جرمانے کی سزا کو جائز ٹھہراتے ہیں۔

فقہائے شافعیہ میں سے محمد بن محمد القرشی المعروف بابن الاخوۃ نے امام شافعیؒ کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک بعض برے افعال کے ارتکاب پر معین مالی جرمانہ واجب ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اونٹوں کی زکوٰۃ کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ چالیس اونٹوں کی ایک بنت لبون یعنی اونٹ کا پورے دو سال کا مادہ بچہ دیا جائے۔ جو شخص یہ حق رضامندی سے ادا کردے اُسے اللہ کے ہاں اجر ملے گا اور جو اس حق کو روکے گا اُس سے میں وصول کرکے چھوڑوں گا (اور اس وصولی کی شکل یہ ہوگی کہ) اُس کے مال کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے گا اور (جرمانہ کے طور پر) اس کے اچھے حصے سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ یہ ہمارے پروردگار کا فیصلہ ہے، محمد کی اولاد کا اس میں کوئی حق نہیں ہے۔"

امام شافعیؒ کا یہ مسلک ابن الاخوۃ نے اپنی کتاب "معالم القربۃ فی احکام الحسبۃ" میں بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر

چاہے تو اُسے اختیار حاصل ہے،

**تعزیر کے مراتب** فقہائے حنفیہ کے نزدیک تعزیر کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ قاضی یا حاکم مجرم کی طرف ایک بار غضب آلود نگاہوں سے دیکھ لے یا اُسے مخاطب ہو کر یہ کہے: "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو نے فلاں حرکت کی ہے" یہ سزا اس وقت اختیار کی جائے گی جب کہ جُرم معمولی درجے کی لغزش شمار ہوتا ہو اور اس کا مرتکب شرفاء اور اہلِ مروت طبقے سے تعلق رکھتا ہو کیونکہ ایسے لوگوں کے لیے اتنی سی سزا بھی کافی اثر رکھتی ہے۔ تعزیر کا آخری درجہ سزائے موت ہے، جب کہ جُرم نہایت سنگین ہو، قومی و اجتماعی پہلو سے گہرے اثرات رکھتا ہو اور سوسائٹی کے اندر سے اُس کے رواج کو روکنا زیادہ سے زیادہ شدت کا متقاضی ہو۔ فقہائے حنفیہ کا یہی مسلک معمول بہ چلا آ رہا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے مروی ہے کہ انھوں نے ایک بار فرمایا تھا: "لوگوں میں جس قدر قباحتیں اور برائیاں رونما ہوں گی اُسی قدر فیصلوں کی نئی نئی شکلیں پیدا ہوتی رہیں گی"[1] اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے دورِ خلافت میں مجرموں کو قید میں رکھنے کے لیے جیلوں کا نظام جاری کیا تھا۔

امام ابوالحسن الماوردی الشافعی نے "الاحکام السلطانیہ" میں بعض مجتہدین اور اصحابِ مذہب کے اقوال

---

ہو۔ پر جتنی کتابیں تالیف کی گئی ہیں ان سب میں نہایت مفصل اور جامع کتاب یہی ہے۔ مؤلف رحمہ اللہ نے اسے بیس ابواب میں منقسم کیا ہے۔ اس کتاب کو حال ہی میں مستشرق روبرٹ لیس نے کیمبرج کے مطبع دارالفنون سے طبع کرا کے شائع کیا ہے اور انگریزی زبان میں اس پر ایک نفیس اور پُر مغز مقدمہ بھی لکھا ہے۔

اس سلسلے میں میرا (یعنی مقالہ نگار کا) خیال یہ ہے کہ فقہائے متقدمین نے جس اندیشہ کی بنا پر مالی جرمانے عائد کرنے میں اپنے اختلافات کا اظہار کیا ہے وہ اندیشہ اب باقی نہیں رہا ہے۔ آجکل عدالتوں میں ایسے جرمانوں کا باقاعدہ سرکاری کاغذات میں اندراج ہوتا ہے۔ اربابِ فضل کے ہاتھ میں جانے کے بجائے وہ براہِ راست سرکاری خزانے میں جمع ہوتے ہیں اور پھر اُن کا متواتر سرکاری آڈٹ ہوتا رہتا ہے۔

[1] حضرت عمر بن عبدالعزیز کا یہ قول علاؤالدین طرابلسی حنفی نے اپنی مشہور کتاب "معین الحکام" جزء سوم میں نقل کیا ہے۔ اسی سے ملتے جلتے الفاظ زیاد سے بھی اُس کے ایک خطبے میں ماثور ہیں۔

آثار نقل کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ارباب اجتہاد نے بعض جرائم میں اُن کی نرمی اور سنگینی کے لحاظ سے سزاؤں کی مقداریں اور درجے متعین کئے ہیں۔ امام ماوردی نے ان تمام اقوال و مسالک کو بیان کر کے تصریح کر دی ہے کہ "اگرچہ بظاہر سزاؤں کی تعیین اور ترتیب مستحسن معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی بنیاد کسی دلیل پر قائم نہیں ہے" یعنی فقہاء اور مجتہدین کی طرف سے بعض تعزیرات کی مقدار اور نوعیت کا تعین کر دینا واجب الاختیار نہیں ہے اور نہ ہی یہ کسی اصل شرعی سے ماخوذ ہے۔ بلکہ اس کا حد سے حد اگر کوئی فائدہ ہے تو صرف یہ ہے کہ اس سے حکام اور اربابِ قضاء کو رہنمائی مل سکتی ہے۔ باقی رہا سزاؤں کی تحدید و ترتیب کا حق، تو وہ شریعت نے کسی ایک شخص یا اشخاص کے لیے مخصوص نہیں کیا ہے بلکہ یہ علی الاطلاق اربابِ امر کو حاصل ہے اور وہ اس میں وقتی و ملکی مصالح کے مطابق حسبِ ضرورت اضافہ و ترمیم کے مجاز ہیں البتہ تازیانہ لگانے کی آخری سزا شریعت نے متعین کر دی ہے۔ اس سے تجاوز کرنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ فقہاء کا فیصلہ ہے کہ تازیانے لگانے میں اس مقدار تک پہنچ جانا جائز نہیں جو اقل الحد (چھوٹی سے چھوٹی حد) کے برابر ہو جائے۔ بلکہ ایک دو کوڑوں کی کمی ہونا ضروری ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی حد چالیس کوڑے ہے جو غلام پر قذف یا شراب نوشی کے جرم میں نافذ ہوتی ہے اور آزاد کی نصف سزا کے برابر ہے۔ فقہاء کے اس خیال کا ماخذ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک ہے کہ:

"من بلغ حداً فی غیر حد، فھو من المعتدین (جس نے حد مارنے کے جرموں کے علاوہ کسی دوسرے جرم میں اتنی سزا دی کہ وہ حد تک پہنچ گئی، تو وہ زیادتی کرنے والوں میں سے ہے)۔ تازیانہ کی سزا کو اگر سنگین کرنا مقصود ہو تو اُسے کوڑوں میں اضافہ کرنے کے بجائے دوسری سزاؤں مثلاً حبس اور جرمانے کی سزا سے شدید کیا جا سکتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ تعزیر کو حد سے بڑھا دینے اور شدید کر دینے کو بھی جائز قرار دیتے ہیں بشرطیکہ ضرورت مجرم کی سخت سرکوبی اور استیصال کا تقاضا کر رہی ہو۔ اس بارے میں امام مالک رحمہ اللہ کا استدلال معن بن زائدہ والی روایت سے ہے، جس میں آتا ہے کہ معن بن زائدہ نے بیت المال کی جعلی مہر بنا کر بیت المال کے محافظ سے کچھ مال وصول کر لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب اس معاملے کا علم ہوا تو آپ نے معن بن زائدہ کو سو کوڑے مارے اور قید کی سزا دی۔ اُس نے دوسری بار پھر یہی حرکت کی۔ حضرت عمرؓ نے پھر اُسے سو کوڑے کی سزا دی۔ تیسری بار پھر وہ اسی جرم میں ملوث ہوا تو حضرت عمرؓ

نے اُسے سو کوڑوں کی سزا کے علاوہ ملک بدر کر دیا۔

**مستوجبِ تعزیر ہونے کا ضابطہ** بلا شبہ تعزیر بتقاضائے مصلحت حکام و قضاۃ کی صوابدید پر موقوف کر دی گئی ہے، اور اس میں از روئے نص کوئی مقدار یا نوعیت ثابت نہیں ہے۔ لیکن سبب سزا کی تحدید یعنی کیفیتِ جُرم کی تشخیص جو کسی فرد کو مستوجبِ تعزیر ٹھہراتی ہے، لازمی ہے۔ فقہائے امت نے اس بارے میں پوری چھان بین اور غور و فکر کے بعد ایک عام ضابطہ مقرر کر دیا ہے جو درج ذیل ہے:

الضابط ان کل من ارتکب منکراً او اذیٰ غیرہ بغیر حق بقول او فعل او اشارۃ یلزمہ التعزیر

اس سلسلے میں اصول یہ ہے کہ جو شخص فعلِ منکر کا مرتکب ہوتا ہے یا کسی دوسرے کو ناحق اپنی زبان سے یا عمل سے یا اشارہ و کنایہ سے ایذا دیتا ہے، اُس پر تعزیر لازم ہے۔

اسی عمومی ضابطے کے تحت وہ تمام جرائم آجاتے ہیں جو ملکی نظام میں اور پُرامن سوسائٹی میں رخنہ اندازی اور فساد انگیزی کا موجب ہوتے ہیں۔ خواہ وہ انسانوں کی باہم ایک دوسرے کی جانوں اور مالوں پر تعدی ہو، اور مار پیٹ، سبّ و شتم، دہشت انگیزی، ڈرانا دھمکانا، فریب دہی، جعل سازی، جھوٹی گواہی (FALSE TES TIMONY WITNESS)، اشیاء میں ملاوٹ کا کاروبار، غلّ و غش اور چالبازی اور لوٹ مار، ذخیرہ اندوزی کے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہوں۔ خواہ وہ مذہبی شعائر کی توہین اور علانیہ ارتکاب معصیت اور اشاعتِ منکرات ہو جیسے رمضان المبارک میں سرِ بازار خورد و نوش کی جسارت، مذہب کا مذاق اور زندقہ و فجور کی ترغیب اور شہری آداب و قواعد (PUBLIC MORALITY) کی خلاف ورزی اور بے حرمتی وغیرہ۔

مذہبی فرائض سے بے پروائی اور تغافل برتنا، بالخصوص تعلیم و تعلّم میں کوتاہی کا ارتکاب کرنا بھی افعالِ منکرہ کی فہرست میں داخل ہے۔ اگر کوئی صاحبِ علم دوسروں کو علم سکھانے کا فریضہ ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے یا بے علم دینی علم کی ضروری مقدار کے حصول میں بھی تکاسل برتتا ہے تو یہ دونوں شریعت کی نگاہ میں مستحقِ تعزیر ہیں[1]۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم"

---

[1] حافظ منذری، مؤلف مختصر سنن ابی داؤد نے "الترغیب والترہیب" میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک روز ؎

علم کا حصول ہر مسلمان پر فرض ہے۔

**کیا تعزیر معاف کی جا سکتی ہے؟** | اگر موجب تعزیر جرم شہریوں کی باہم تعدی اور ضرر رسانی کی قبیل میں سے

۵۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا۔ اس میں آپ نے پہلے مسلمانوں کے ایک گروہ کی ستائش کی اور پھر دوسرے گروہ کو مخاطب ہو کر فرمایا: "ان لوگوں پر کیا افتاد پڑی ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں کو نہ دینی امور کی تعلیم دیتے ہیں، نہ وعظ و نصیحت کرتے ہیں، نہ ان کو نیکیوں کی تلقین کرتے ہیں نہ برائیوں سے روکتے ہیں۔ اور نہ خود ہمسایوں کو یہ خیال آتا ہے کہ وہ از خود اپنے عالم ہمسایوں کی طرف رجوع کریں۔ ان سے علم سیکھیں، دین میں تفقہ حاصل کریں، وعظ و نصیحت سنیں۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ لوگوں کو اپنے ہمسایوں کو دین سکھانا چاہیے، دینی امور میں انہیں تفقہ سے بہرہ مند کرنا چاہیے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہنا چاہیے۔ اور اُدھر خود لوگوں کو بھی اپنے ہمسایوں سے علم حاصل کرنا چاہیے اور اپنے اندر فہم و فقاہت پیدا کرنا چاہیے۔ اگر ان باتوں کی پابندی نہ کی گئی تو میں ان سب کو دنیا میں بہت جلد سزا دوں گا۔" آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کو سن کر کچھ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور پوچھنے لگے: یا رسول اللہ! آپ کے مخاطب کون لوگ ہیں۔ صحابہ ہی میں سے کچھ لوگوں نے جواب دیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روئے سخن اشعری قبیلہ کی طرف ہے۔ اس قبیلے کے لوگ خود تو صاحب علم و بصیرت ہیں مگر ان کے پڑوسی اسی طرح بدو اور کندہ ناتراش ہیں۔ اشعریوں کو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطبہ کی خبر ملی تو وہ فوراً آپ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ نے دوسرے لوگوں کی تعریف فرمائی تھی اور ہماری مذمت کی ہے۔ ہم سے کیا سرزد ہوا ہے؟ جواب میں آپ نے اپنی سابقہ تہدید کا اعادہ فرمایا وہ کہنے لگے: کیا ہم اپنے علاوہ لوگوں کو بھی سوجھ بوجھ والا بنا دیں۔ آپ نے پھر اپنے کلمات کو دہرایا۔ انھوں نے پھر یہی کہا کہ کیا ہم غیروں کے اندر بھی سوجھ بوجھ پیدا کر دیں۔ اس پر آپ نے پھر اپنی وعید کو دہرایا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا یا رسول اللہ آپ ہمیں ایک سال کی مہلت عنایت فرما دیں۔ چنانچہ آپ نے ان لوگوں کو تعلیم ہمسایہ کے لیے ایک سال کی مہلت دے دی اور پھر قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی، لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۚ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ، كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ "بنی اسرائیل میں جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے۔"

نہ ہو بلکہ صرف مذہبی شعائر کی بے حرمتی اور ارتکاب معصیت کی بنا پر ہو تو یہ تعزیر خالص شریعت کا حق شمار ہو گی۔ لیکن اگر جرم کسی کو مار پیٹ کرنے، گالم گلوچ دینے یا دوسروں کو کسی نوعیت کی ایذا پہنچانے کا ہو تو مجرم پر تعزیر کا حق بیک وقت دو طرف سے عائد ہو گا۔ ایک اس شخص کی داد خواہی کا حق جس کو مجرم کے ہاتھوں تکلیف پہنچی ہے اور دوسرا شریعت کا حق جو اُسے سوسائٹی کو پُرامن رکھنے اور شہریوں کی تادیب و اصلاح کے بارے میں اصولی طور پر حاصل ہے۔ دوسری صورت میں یعنی جب کہ تعزیر کسی مظلوم شخص کے حق کی بنا پر قائم ہو اور وہ شخص انتقام لینے کا مطالبہ کر رہا ہو تو عدالت کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ مجرم کی سزا کو معاف کر دے یا منسوخ کر دے۔ یہ انسانی حقوق کی صریح پامالی ہے اور عدالت کو انسانوں کے حقوق ساقط کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ البتہ اگر مدعی اپنی رضامندی سے مدعا علیہ کو معاف کر دے یا تعزیری سزا خالص شرعی حق کے تحت کسی مقدمے میں نافذ کی جا رہی ہو تو اس صورت میں بھی قاضی پر لازم ہے کہ صاحب حق کی طرف سے عفو و درگزر کے باوجود شرعی حق کو قائم کرتے ہوئے مجرم کو سزا دے۔ فقہاء کی صراحت کے مطابق قاضی یا حاکم محض اپنے حق کو معاف کرنے کا مجاز ہے، لیکن شہریوں کی تہذیب و اصلاح اور انسدادِ مفاسد کے سلسلے میں ریاست کو جو حقوق حاصل ہیں اُسے وہ معاف نہیں کر سکتا[1] اسی بنا پر فقہاء کا یہ فیصلہ بھی ہے کہ اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص کو مارتا ہے اور وہ دوسرا شخص جواب میں ضارب کو مارتا ہے تو دونوں مستوجب تعزیر ہونگے۔

طبری نے تاریخ الامم والملوک میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک بار حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے راستے میں جاتے ہوئے کسی فریادی کی پکار سنی، آپ جلدی کے ساتھ اس کی طرف لپکے اور فرمایا: "مددگار حاضر ہے۔" چنانچہ آپ نے قضیے کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ مستغیث نے ایک شخص کے ہاتھ سات درہم

---

۴۔ اور زیادتیاں کرنے لگے تھے، انھوں نے ایک دوسرے کو بُرے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ برا طرزِ عمل تھا جو انھوں نے اختیار کیا (المائدہ۔ ۷۸) تعلیم و تعلم میں کوتاہی کو اجتماعی جرم قرار دینا فی الواقع ایسا حیرت انگیز موقف ہے جو ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے یا بعد تاریخ کے کسی دور میں بھی اختیار نہیں کیا گیا ہے۔

[1] الاحکام السلطانیہ از ابوالحسن ماوردی باب التعزیر

میں ایک کپڑا فروخت کیا۔ ان میں سے ایک درہم ناقص تھا۔ بیچنے والے نے اُسے واپس کرنا چاہا مگر خریدار نے لینے سے انکار کر دیا۔ جب کپڑے والے نے اُسے واپس لے لینے پر اصرار کیا تو خریدار نے اُس کے ایک گھونسا رسید کر دیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس واقعہ کا گواہ طلب کیا۔ گواہ نے اس واقعہ کی تائید کی۔ حضرت علی نے گاہک کو زمین پر بٹھا دیا اور کپڑے والے کو قصاص لینے کا حکم دیا۔ اُس نے کہا: "امیرالمومنین! میں نے اسے معاف کر دیا"۔ امیرالمومنینؓ نے کہا: "تو نے محض حق وصول کرنے میں احتیاط کا پہلو اختیار کیا ہے" اس کے بعد حضرت علیؓ نے خود آگے بڑھ کر کپڑے والے کو سات درے مارے اور فرمایا: "ھذا حق السلطان" (یہ ریاست کا حق تھا) طبری جلد ۶ صفہ۔

اگر ستم رسیدہ بطور خود مجرم کا فعل معاف کر دے یا تعزیر کا نفاذ کسی ایسے مقدمے میں ہو رہا ہو جو حقِ شرعی کے تحت قائم کیا گیا ہو تو قاضی کو اگر یہ یقین ہو جائے کہ ارتکاب جرم کرنے والا قبل از وقت راہ راست پر آ چکا ہے اور قاضی کا یہ خیال بھی ہو کہ درگزر کر دینا اس کے لیے مزید باعثِ اصلاح ہو گا تو اس استثنائی صورت میں وہ مجرم کو معافی دے سکتا ہے۔ اس ضمن میں یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کا ارباب عدل و قضاء کو یہ حق دے دینا کہ وہ مقدماتِ تعزیر میں (جس کی صورت اوپر گزر چکی ہے) سزا دیئے بغیر مجرم کو معاف کر دینے کے مجاز ہیں، حقِ جمہور میں دست اندازی کے مترادف نہیں ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، اربابِ عدل و قضا کو یہ اختیارات بلا شرط اور علی الاطلاق حاصل نہیں ہیں بلکہ صرف مصالح خصوصی کے پیشِ نظر ان کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس جب ہم جدید فوجداری اور تعزیری قوانین اور تصوراتِ قانون کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جدید قوانین و دساتیر جو ہمارے ملکوں میں رائج ہیں یا دیگر ترقی یافتہ ممالک میں نافذ ہیں، صدر ریاست کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ قتل و ڈکیتی کے بڑے سے بڑے جرائم میں مجرموں کو معافی دے سکتا ہے۔ صدر ریاست کا یہ حق عفو (MERCY APPEAL) عدالتِ عالیہ کے فیصلے پر بھی بالاتری رکھتا ہے اور وہ جب بھی کسی قضیے میں "مصلحت" دیکھتا ہے اسے بلا تامل استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ اور اس سب پر ستم یہ ہے کہ اس عفو و درگزر کو حقِ جمہور میں دست درازی کے مترادف نہیں گردانا جاتا۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ اسلام میں تعزیری قوانین عام ملکی تعزیرات سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہیں بلکہ یہ انہیں کے تحت آتے ہیں۔ تعزیری قوانین میں تغیر پذیری کی خصوصیات موجود ہیں، اور وہ زمان و مکان کی قیود میں محصور نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں یہ صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے کہ وہ عصری تقاضوں کے مطابق نوعیت و مقدار کے ہر سانچے میں ڈھل سکتے ہیں۔ انہی خصائص کی وجہ سے اربابِ فقہ و قانون نے تعزیرات کو "مصلحتِ شرعی" کے دائرے میں شمار کیا ہے۔ مصلحتِ شرعی ان کے نزدیک حکومتِ اسلامی کا وہ عمل ہے جو اس نے مصلحتِ وقت اور مفادِ عامہ کے تحت کیا ہو اور خواہ اس فعل کے جواز میں کوئی مخصوص شرعی دلیل وارد نہ ہوئی ہو"۔ اس تعریف کی رُو سے مصلحتِ شرعی دراصل مصالحِ مرسلہ یا استصلاح الحال ہی کی ایک قسم ہے۔ بلکہ فقہاء نے یہاں تک فرما دیا ہے کہ: کتابِ قانون کا بابِ تعزیر ہی فی الحقیقت شرعی مصلحت کے احکام کا نگران اور انہیں کامیاب و نتیجہ خیز بنانے کا کفیل ہے تعزیری قوانین کی تدوین ہو سکتی ہے؟ اس مقام پر قانون کے طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر شریعت نے تعزیر کی تعیینِ نوعیت و مقدار کو حکام و قضاۃ کی رائے پر چھوڑ دیا ہے تو کیا یہ تفویضی اختیارات مختلف النوع جرائم کے لیے مختلف سزائیں مقرر کرنے اور انہیں قانونی شکل میں مدون کرنے میں حائل نہیں ہوتے اور اس کی نفی نہیں کرتے ہیں جیسا کہ موجودہ دَور میں فوجداری قانونِ عقوبات ( PENAL CODE ) میں یہ صورت اختیار کی جاتی ہے کہ وقتی و ملکی داعیات کے تحت مختلف سزاؤں کا مجلّہ احکام وضع کیا جاتا ہے اور انہیں عدلیہ کے ذریعے سے نافذ کیا جاتا ہے۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ قانون سازی اور سزاؤں کے احکام کی تدوین کا عمل خود اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت نے یہ معاملہ اربابِ امر کو تفویض کر رکھا ہے۔ اس لیے یہ قانون سازی اور حدبندی آزادیٔ رائے کو ختم نہیں کرتی بلکہ آزادیٔ رائے کا ثبوت فراہم کر رہی ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں فوجداری قوانین کی بہت بڑی تعداد اسلامی نقطۂ نظر سے جائز تعزیرات کے حدود میں داخل ہے بجز اس کے کہ حدود کے نفاذ میں بے اعتنائی برتی جاتی ہے یا قصاص کے مقدمات میں بعض صورتوں میں شریعت سے ہٹ کر قانون سازی کی گئی ہے۔ اسی طرح موجودہ قانون ساز ادارے فوجداری قوانین کی تدوین کے

ضمن میں کسی جرم کی سزا کے لیے اُس کی صرف ابتدائی اور آخری حدود کی تصریح کرتے ہیں اور باقی تمام جزئیات اور درمیانی مقداریں اربابِ عدل و قضا پر چھوڑ دیتے ہیں یہ بات بھی اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ پیغمبر نے اربابِ عدل و قضا پر اعتماد کیا ہے اور ہر جرم کی موزوں سزا کی مقدار انہی کو تفویض کر دی گئی ہے۔ شریعت اسلامی نے ان تفویضی اختیارات کو بنیاد بنا کر سزاؤں کی تحدید کو ہر زمانے کے صاحبِ امر اداروں پر چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ زمان و مکان کے مطابق ان میں تصرف کرتے رہیں۔ فوجداری اور تعزیراتی قانون سازی کے وقت اربابِ امر کا سزاؤں کی تعیین و تحدید کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ انھوں نے اپنے قانونی اختیارات (LEGAL ATHORITY) کو روبعمل لاتے ہوئے گویا ان سزاؤں کو بالقوۃ نافذ کر دیا ہے۔ اگرچہ یہ نفاذِ سزا وقوعِ جرم سے قبل ہوتا ہے لیکن اس کا فائدہ یہ ہے کہ مجرم اقدامِ جرم سے قبل ہی اپنی سزا کی نوعیت و مقدار سے آگاہ رہے گا۔ اب یہ بدیہی امر ہے کہ قبل از وقوعِ جرم سزا کا معین کر دینا بھی انہی اختیارات کے اندر ہے جو تعیینِ سزا کے باب میں شریعت نے اربابِ امر کو ہمہ وقتی سونپ رکھے ہیں۔

**تعزیر ذریعۂ اصلاح ہے** | خاتمۂ بحث پر ہم بیروت کے مشہور سکالر ڈاکٹر صبحی محمصانی ایڈووکیٹ کی کتاب "النظریۃ العامۃ للموجبات والعقود" کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جو ڈاکٹر موصوف نے اصولِ تعزیر کی بحث میں ایک نوٹ کی صورت میں لکھا ہے۔ ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں:

> "آپ نے اس سے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ شریعتِ اسلامی میں تعزیر ایک ایسا لچکدار وسیلۂ عدل ہے جو صاحبِ امر کے میدانِ عمل کو وسیع کرتا ہے اور اُسے یہ مواقع فراہم کرتا ہے کہ وہ عمومی مصلحت کے تحت فساد انگیز عنصر کی اصلاح کر سکے من جملہ دوسرے دلائل کے یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ شریعت اسلامی جمود اور ٹھہراؤ کے اس اتہام سے بری ہے جو بعض لوگ اس پر دیدہ دلیری سے لگاتے ہیں۔ بلکہ یہ عصری مصالح کے مطابق ایک تغیر پذیر اور وقتی ضروریات کو بدرجۂ کامل بروئے کار لانے والی شریعت ہے۔ اسی طرح منجملہ دوسرے وسائل کے تعزیر بھی ایک ایسا وسیلہ ہے جو قاضی کو فوجداری احکام کی تنفیذ میں ہر واقعہ کے مطابق اور ہر مجرم کے حسب حال پوری آزادی سے بہرہ مند کرتا ہے تاکہ وہ سزا کی اصل غرض و غایت تک پہنچ سکے۔ اور سزا کی غرض و غایت یہ ہے کہ مجرم خود بھی اپنے جرم سے باز آجائے اور اُس کے ہم جنس اس کی تقلید سے دامن کش ہو جائیں۔"